ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

دینی درسگاہوں کے لیے نصاب کا مسئلہ

آج سے چند سال پہلے جب جامعہ اسلامیہ بہاولپور قائم ہوئی تو اس کے لئے تعلیمی نصابات کا ایک خاکہ مدون کر کے ملک کے ماہرین تعلیم سے ان کے بارے میں آراء طلب کی گئیں۔ اس سلسلے میں جب جناب برہان احمد فاروقی صاحب سے رجوع کیا گیا تو آپ نے اپنے مخصوص علمی پیرائے میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا۔ ان کی یہ تحریر اپنی جگہ ایک مقالے کی صورت میں اختیار کر گئی جس سے "اسلامی تعلیم" کے اہم موضوع کے کئی نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ قارئین کی دل چسپی کے لئے ہم ڈاکٹر صاحب کا یہ تبصرہ ان کی اجازت سے شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

کسی اسلامی یونیورسٹی یا دینی دانش گاہ کے نصابات مرتب کرنے کے سلسلے میں یہ امر پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ یونیورسٹی کا وظیفہ ایسے علم کی تدریس ہے جسے تحقیق و تفحص کے بعد از سر نو اس طرح مدون مرتب کیا گیا ہو کہ اس سے حیات ملی کے مسائل حل ہو سکیں اور تحقیق و تفحص کی احتیاج اسی وقت پیش آتی ہے۔ جب دیا ہوا علم مسائل حیات کو حل کرنے میں بے اثر اور بے نتیجہ ہو گیا ہو۔

چونکہ تعلیم (دینی ہو یا لادینی) حیات اجتماعی کو دوام و استمرار عطا کرنے کا عمل ہے۔ اس لئے دینی یا لادینی نقطہ نگاہ سے نظام تعلیم، مقصد نصاب، اساتذہ اور طلباء پر مشتمل ہو گا۔ لیکن جس الجھن میں ہم مبتلا ہیں اس میں "دینی" اور لادینی (SECULAR) کا امتیاز پیش نظر نہیں رہا۔

سیکولر (SECULAR) کا مطلب ہے کہ زندگی کے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کا کوئی تعلق مذہب سے نہ ہو۔ اور مذہب کی حیثیت انفرادی، نجی، ذاتی، شخصی، باطنی پہلو سے متعلق رہے۔

جب سے ہم برطانوی استعمار کے زیر اثر آئے، مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرانے کے لئے معاشرے

کی بنیاد استعماری طاقتوں نے فقہ حنفی (بحوالہ فتاوے عالمگیریہ) کے بجائے جغرافیہ سے وابستہ کر دی۔ معیشت حرام وحلال کے امتیاز سے آزاد ہو گئی۔ سیاست کا انداز بھی لادینی ہو گیا۔ اور اخلاق مصلحت پرستی کا نام رہ گیا، اور نظام تعلیم بھی لادینی ہو گیا، تو عقیدے کا اثر نہ معاشرے پر رہا نہ معیشت پر، نہ سیاست پر، نہ اخلاق پر، نہ تعلیم پر۔ اس صورتِ حال نے عقیدے کو ایک وہم باطل (MYTH) میں تبدیل کر دیا۔ اور عبادات کی حیثیت اس لئے رسوم وظواہر کی رہ گئی کہ معاشرہ، معیشت، سیاست اخلاق اور تعلیم پر عبادات کا کوئی اثر باقی نہیں رہا، عبادات رسوم و ظواہر (RITUALS) میں تبدیل ہو گئیں۔

ان احوال میں وہ نظام تعلیم جسے درس نظامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بانی فرنگی محل لکھنو کے دو عالم ملا نظام الدین اور ملا قطب الدین تھے، جو ہمارے دور اقتدار میں آزاد تعلیم (LIBRAL EDUCATION) کا نظام تھا، جس میں طب ہیئت و ہندسہ بھی شامل تھا۔ برطانوی استعمار کے لائے ہوئے لادینی نظام تعلیم کے مقابلے میں دینی نظام تعلیم متصور ہونے لگا ہے اور اس کا مقصود آج تک اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اُجرت کے بدلے مراسم دینی کو ادا کرنے والی ایک جماعت درسِ نظامی کے ذریعہ پیدا کی جائے۔ بیشتر دینی مدارس کا جائزہ لینے سے ہر دینی درسگاہ میں بعض پیشہ ور (PROFESSIONAL) طلبہ بھی ملیں گے، جن کے سہارے مدرسوں کو مالی امداد حاصل ہوتی ہے۔

اسلامی یونیورسٹی بہاول پور کے مطبوعہ نصاب تعلیم کے پیش لفظ میں غایت تعلیم کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہے، ہم نے مذہب اور تمدن کو محفوظ کرنے کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا اور خداوند کریم نے اپنی مہربانی سے ہمیں پاکستان جیسی نعمت بخشی۔ اِس لئے ہمارے علماء کا یہ اخلاقی، قومی بلکہ مذہبی فریضہ ہے کہ اسلام کے داعی اور سچے اصولوں کو اس زمانے کی ضرورت اور تقاضوں پر چسپاں کر کے دکھائیں کہ اسلام کے اصول اٹل اور سچے ہیں۔"

اسلامی یونیورسٹی بہاول پور کا نصب العین صوبہ پنجاب اور پاکستان کے محکموں اور تعلیمی

اداروں کے لئے علماء کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا ہے جو دینی اور اسلامی علوم پر کامل دسترس رکھتی ہو اور تعلیمات اسلامی کو دور حاضر کے جدید علوم کی روشنی میں پیش کر سکے اور ملک کے روز افزوں معاشی مسائل کے حل کرنے میں ملک و ملت کے تمام بہی خواہوں کے شانہ بشانہ کام کر سکے۔ ساتھ ہی جامعہ سے ایسے وسیع النظر اور مخلص علماء پیدا ہوں، جو اسلام کی ترجمانی اور تفہیم میں اُن علوم سے کماحقہ استفادہ کر سکیں۔ اور قوم کی علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی میں حکومت وقت کا ہاتھ بٹائیں اور اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کے جذبے سے سرشار ہوں۔ تاکہ ملک کے گوشے گوشے میں دینی اقدار کو عام کر کے حکومت کے قومی ترقیاتی مقاصد کو کامیاب بنائیں۔

پچیس سال سے علماء اور جدید تعلیم یافتہ نسل دونوں اعصابیت (NEURASIS) کا شکار ہیں کیونکہ پچیس سال سے ہم اساس اجتماعیت کی حیثیت سے اسلام کے بجائے وطن پرستی کی تبلیغ کر رہے ہیں اور وطن پرستی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر علامہ اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

وطن پرستی ہی کی تبلیغ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہو کر ایک لادینی نظام کی شکل میں بھارت کے لئے قابل قبول ہوا اور اسی تبلیغ سے مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کا تصور پیدا ہوا ان حالات میں مذہب کی حیثیت ایک وہم باطل (MYTH) سے زیادہ نہیں رہ جاتی سیاسی مقاصد کے لئے اس وہم باطل (MYTH) کو استعمال کرنے کی بنیاد پر (POLITICAL MYTH) کی اصطلاح وضع ہوئی تھی۔

اب غور طلب یہ ہے کہ اسلامی موقف پر اصرار برقرار رہے تو تعلیم کا انداز کچھ اور ہوگا اور یہ اصرار برقرار نہ رہے تو کچھ اور انداز ضروری ہوگا، اور اگر اصرار میں خلوص ہے تو تقاضے کچھ اور ہوں گے اور موجودہ طرز عمل سے مختلف طرز عمل اختیار کرنا ضروری ہوگا اور خلوص اور عدم خلوص سے بے نیازی کی صورت میں تعلیم کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں رہے گی۔

موجودہ اضطرابیت نے ہمیں یہاں پہنچا دیا ہے کہ اگر علماء کے نزدیک مذہب کے اس وہم باطل (MYTH) کو عقیدہ راسخہ بنانے اور رسوم و ظواہر کو عبادات صحیحہ میں بدلنے کی کوئی حتمی قطعی اور یقینی تدبیر ہے تو اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا اور اگر نہیں ہے تو ہمارے پاس "یقین اور تلقین" کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں موجود بے یقینی کا انداز اسی طرز فکر کا نتیجہ ہے۔

قرآن یقین کو عمل پر مقدم رکھتا ہو اور یقین راسخ کرنے کی کوئی حتمی تدبیر مہیا نہ کرتا ہو تو "اسلام پسندی" جس کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے۔ "خود پسندی" سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔

یہ سب کچھ "معیاری دین" اور "معمول بہ دین" کے درمیان امتیاز کے شعور سے عاری ہونے کا نتیجہ ہے۔ معیاری دین سے اسلامی فضائل زندگی میں پیدا ہوتے ہیں اور معمول بہ دین یعنی فقہ ان فضائل کو محفوظ رکھنے کی تدبیر ہے اور طریقت فقہی احکام کے اتباع میں خلوص پیدا کرنے کی۔ اس طرح شریعت اور طریقت دونوں کی حیثیت معمول بہ دین کی ہے۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ فاحشہ کاری "سود خوری کا نظام، جوا، سٹہ، ریس اور نامعلوم سودے (UNKNOWN BARGAINS) آئینی طور پر مسلّم معیشتی تخلیق کے عمل کی حیثیت سے مروج ہیں۔ تو اس حال میں وہ کونسی اسلامی فضیلت ہے جس کا تحفظ ایسی فقہ سے کیا جا سکے گا، جس کے پیچھے قوت نافذہ کی پشت پناہی باقی نہ رہ گئی ہو!!!

ان احوال میں جدید تعلیم یافتہ نوجوان یہ سمجھتا ہو کہ اصلی علم دین علماء کے پاس ہے اور میں لادینی علوم میں بھی بصیرت سے محروم ہوں۔ علماء یہ سمجھتے ہوں کہ زندگی کے تمام نظام (معاشرتی، معاشی، سیاسی، اخلاقی، تعلیمی) اور ان سے متعلقہ مسائل لادینی نقطہ نظر سے حل کئے جا رہے ہیں اور ہم جدید علوم سے نہ تمتع کر سکتے ہیں نہ مسائل حیات کے حل کرنے کی حیثیت میں ہیں۔ تو اس سے علوم دینیہ کی بے تاثیری کا احساس پیدا ہوگا۔

اس دینی اور لادینی دونوں طرز کے علوم کو جمع کرنے سے ان کی بے تاثیری میں اضافہ ہوگا۔ زندگی

بسر کرنے کے اعتبار میں تزلزل پیدا ہوگا۔ اور اپنی بے مائیگی کے احساس میں بھی اضافہ ہی ہوگا، کیونکہ ناقصوں کے ملانے سے نقص میں اضافہ ہوگا جو معاشیات ہماری قوم کے معاشی مسئلے کو حل نہیں کر سکی۔ اس سے علماء کرام کو مزین کر کے معاشی مسائل کیسے حل ہوں گے۔ جدید معاشیات کا ماہر تو ہماری معیشت پر دوسروں کی گرفت کو شدید تر کرانے کی تدبیر کا نام معاشیات رکھتا ہے۔ اس میں اضافہ یہ ہے کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ اسلام کا بھی کوئی معاشی نظام ہے حالانکہ معاشی نظام طریق پیداوار سے متعین ہوتا ہے اور طریق پیداوار آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ تاریخی مؤثرات سے رائج اور مقبول ہوتا ہے اور اسلام کے لئے ہر وہ نظام تخلیق معیشت قابل قبول ہے جو معاشی تخلیق میں تعاون کرنے والوں کے درمیان حقوق کے تصادم کو رفع کرا سکے۔

اسلام نے ہر معاشی نظام کو خواہ وہ گلہ بانی نظام ہو یا تجارتی سرمایہ داری ہو یا زراعت ہو یا جاگیرداری بعض ایسے تصرفات کے ساتھ اپنایا کہ ان میں حقوق کا تصادم باقی نہ رہے۔ اور وہ تصرفات ہم اس وجہ سے کر سکے کہ اس وقت ہم معاشی انقلاب کی قیادت کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آج معاشی انقلاب کی قیادت ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے اور بین الاقوامی سیاست میں ہم مضمحل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم پاکستان کے اندر اخلاقی اعتبار سے ایک صحت مند معاشی اعتبار سے عادلانہ اور عمرانی اعتبار سے مستحکم معاشرہ قائم کر کے ہی اپنے وجود کو مؤثر بنا سکیں گے۔ اور جغرافیہ کی اساس پر ایسا معاشرہ پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اسلام کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔

عالمی سطح پر استعماریت اور نو استعماریت کی گرفت نے اسلامی اور غیر اسلامی معاشرے کے امتیازی خصائص کے مؤثرات سے بنی نوع کو بڑی حد تک محجوب کر دیا ہے۔ اسلامی معاشرہ فرائض کی بجا آوری کے اصرار پر قائم ہوتا ہے اور غیر اسلامی معاشرہ مفادات کے مطالبہ پر اصرار کی غرض سے قائم ہوتا ہے۔ فرائض کی بجا آوری پر اصرار ہو تو حقوق کا تصادم ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس حقوق کے مطالبے پر اصرار ہو تو حقوق کا تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مطالبہ حقوق سے معاشی تخلیق کا عمل معطل ہو جاتا ہے اور فرائض کی بجا آوری سے وہ تعطل رفع ہو جاتا ہے جو معاشی تخلیق میں پیدا ہوتا ہے۔

سیاست میں جمہوریت لادینی ملوکیت کے خلاف احتجاج ہے۔ جس میں بادشاہ کی زبان

سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے اور خود بادشاہ نہ تو کسی قانون کے تابع نہ معاہدۂ عمرانی میں ایسا فریق ہے جس کے کچھ فرائض بھی ہوں۔ ایسی ملوکیت ہماری پوری تاریخ میں کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ہم نے سیاست میں جمہوریت کو اپنایا ہے۔ جمہوریت کا طریق کار یہ ہے کہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں منظم ہوں اور حزبِ اختلاف حزبِ اقتدار کو ہٹا کر اقتدار حاصل کرنے کے لئے حزبِ اقتدار کے ہر کمال کو نقص ثابت کر سکے۔ اور اپنے ہر عیب کو ہنر منوا سکے تو جمہوری طور پر برسر اقتدار آ سکتی ہے۔ یہ طریق عمل کس قدر اسلامی ہے اور اس طریق کار میں اسلام کے اسلام رہنے کے کتنے امکانات ہیں۔ اسے اسلام کے دعویدار سیاسی طالع آزما بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

ان احوال میں اگر علماء کو جدید معاشیات اور جدید سیاسیات کے علوم سے بہرہ ور کیا بھی جائے تو کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ درآں حالیکہ علماء کے اپنے علوم کے بے نتیجہ ہونے کا احساس انہیں اس بنا پر ہوا ہو کہ انہوں نے تفسیری علوم کو جو انسانی ذہن کے تراشیدہ تھے۔ قرآن مجید کا بدل سمجھا اور تفسیری علوم علماء دین کے لئے "تزئین" کا ذریعہ تھے۔ مسلمانوں کی تقدیر کو بدلنے کا ذریعہ نہ تھے۔ تقدیر تو قرآن مجید ہی کے عطا کردہ علم سے بدلی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے مطالعہ کا کوئی منہاج (METHOD) ہو جو قرآنی نصب العین کے قابلِ حصول و ممکن الحصول ہونے کو باور کرا سکے اور قرآنی علم کو اس تشتت افکار سے نجات دلا سکے۔ جس میں تعبیرات کے اختلاف نے ہمیں مبتلا کر کے قرآنی علم میں یکسانی کے نمونے سے محروم کر دیا ہے۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ تخصیص کے درجے میں جن علوم کا مطالعہ ضروری سمجھا گیا ہے وہ سب علوم ان افکار کو بدلنے میں بے اثر رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو اعلیٰ ترین غایت کے پیش نظر اعلیٰ ترین معیار پر سب نصابات طے پائے جائیں۔

کیا تخصیص فی التفسیر کے آٹھوں پرچے ملا کر بھی قرآنی ہدایت کے نتیجہ خیز ہونے کے اعتماد کو بحال کر سکیں گے؟ اور کیا تعبیر کے بجائے نصّ کے ہدایت ہونے کا یقین میسّر آ سکے گا؟ اور ان تعبیرات کے تحت جو پراگندہ خیالی پیدا ہوئی ہے کیا وہ فکر کی کوئی مدت مقرر کر سکے گی۔ خود غائت نزول قرآن کی نسبت ذہن التباس کا شکار ہے۔ ایک طبقہ سمجھتا ہے کہ نزول قرآن کی غایت صرف اخلاقی اصلاح کرنا ہے اگر اسے مانا جائے تو کیا قرآن مجید کتاب الھدیٰ کی حیثیت ناقص متصور نہ ہو گا اور

زندگی کے باقی مسائل میں انسانی افکار سے تمتع کرنا لازم نہیں آئے گا۔ اگر تمام مذاہب کے بقاء کا مقصود اخلاقی اصلاح ہی ہو تو جو اصلاح دوسرے مذاہب کے اتباع سے پیدا ہوگی وہ قابلِ قبول ہوگی یا نہیں اگر وہ قابلِ قبول ہوگی تو ان الدین عند اللہ الاسلام کا کیا مفہوم باقی رہے گا۔ اور اگر قبول نہ ہو تو یہ طرزِ عمل خود پسندی کے علاوہ اور کیا قرار پائے گا۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ قرآن مجید زندگی کے ہر پہلو میں ہدایت مہیا کرنے کے لئے نازل ہوا ہے اور یہ ہدایت تعبیر سے حاصل ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نص ہدایت نہیں تعبیر ہدایت ہے۔ حالانکہ تعبیر انسانی ذہن کی زائیدہ ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اہل السنت کے ہاں تعبیر میں اختلاف اصولاً روا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر اختلاف کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور تعبیرات میں اصرار سے اپنے موقف کی تائید اور دوسروں کے موقف کی تردید ہی مقصد رہ جاتا ہے جو ایک تخریبی مقصد ہے۔ ایک اور دشواری یہ ہے کہ جب سے بین الاقوامی سطح پر اضمحلال پیدا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں بھی کتاب الہدیٰ سے مسلمانوں کی حالت کو نہ بدلا جا سکا جو کتابِ ہدایت سے محروم ہیں۔ اس نے جدید تحریکات سے باخبر تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اعتماد زائل کر دیا ہے اور خود علماء اپنے طور پر ہر کتاب کے دیباچے پر حلقہ درس سے اور ہر منبر سے یہی کہہ رہے ہیں کہ حق کو شکست ہوگئی ہے اور باطل غالب آگیا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے پڑھنے سے تو غلبہ حق کی آرزو پیدا ہوتی ہے لیکن مشاہدہ غلبہ باطل کا ہوتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو کیا تخصص فی التفسیر کا یہ مطالعہ جو آٹھ پرچوں پر مشتمل ہے۔ غلبہ حق کا اعتماد بحال کر سکے گا۔ دراصل یہ بے اعتمادی اور بے تاثیری نتیجہ ہے قرآن مجید کو کتب سابقہ کی تمثیل پر قیاس کرنے کا حالانکہ قرآن مجید کی حیثیت ناسخ ۔ توریت و زبور و انجیل کی ہے اور صحف ماسبق کے ناسخ ہونے کا تصور اس وقت حق بجانب ہوگا۔ جب قرآن مجید نئی ہدایت اور نئی بعثت کی احتیاج سے نوع انسانی کو بے نیاز کرتا نظر آئے اور غیر پیغمبرانہ قیادت کی رہنمائی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اتباع و نفوذ سے تمام پسندیدہ نتائج کے پیدا ہونے کی ضمانت میسر ہو تب ہی تکمیل دین کا صحیح مفہوم متصور ہوگا۔ لیکن مذہبی ذہن کے نزدیک تکمیل دین کا تصور بھی اب وہ نہیں ہے جس کا اعلان حجۃ الوداع کے روز نازل ہونے والی اس آیت میں کیا جا رہا ہے۔ الیوم

اکملت لکم دینکم اور تکمیل دین کا تصور یہ ہوگیا ہے کہ ہمارا دستور حیات مکمل ہے۔ حالانکہ اس حیثیت سے وہ صرف فقہ کی تکمیل کے ہم معنی ہو جاتا ہے اور جس وقت قرآن مجید تکمیل دین کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس وقت فقہ مدون نہیں ہوئی تھی۔

تخصص کی سطح پر دوسرا فن حدیث ہے اور تخصص فی الحدیث سے یہ صحیح ہے کہ علم حدیث میں مہارت پیدا ہوگی، مگر یہ مہارت اس مقصد کو ہرگز پورا نہ کر سکے گی۔ حدیث کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کے لئے اسلامی سیرت کی تشکیل میں اس معاشرے کی نشو و نما میں اس کے خلاف مؤثرات کو روکنے میں اور زوال ہو جائے تو زوال کو عروج میں بدلنے کے لئے حدیث سے کیا ہدایت میسّر آئے گی۔ یہ تقاضے تو دانستہ و بالارادہ اسی مقصد کے تحت مدون کئے ہوئے درس سے پورے ہوں گے۔

اسی طرح تخصص فی الفقہ و القانون سے بھی ایک نظر قانون کی نشو و نما کے مدارج پر تو یقیناً پیدا ہوگی، مگر وہ قانون اور فقہ جس کے پیچھے آج قوت نافذہ (LEGAL SAUCTION) نہیں ہے ان اسلامی فضائل کو کب پیدا کر سکے گی۔ جو لادینی (SECULAR) معاشرے اور لادینی تعلیم میں اپنا نام و نشان کھو چکے ہیں۔

اسی طرح تخصص فی التاریخ سے جو مقصود ہو سکتا تھا وہ تو یہ تھا کہ اسلامی تاریخ کی غلط تعبیر نے اور شیعہ سنی اور خارجی فرقوں کی عصبیت نے جو تاریخ پیش کی ہے اس کا پیدا کیا ہوا یہ اثر کیسے زائل ہوگا کہ قرآن مجید جس معاشرے کو مخاطب کرتا ہے وہ کبھی وجود میں آیا بھی تھا یا نہیں۔

وہ علمی مواد جو ہمارے پاس موجود ہے اس کی بنیاد پر قومی مسائل کو حل کیا جا سکتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی کہ دینی علوم کی بے تاثیری کو رفع کرنے کے لئے لادینی علوم کا سہارا لیا جائے۔

اسلامی تاریخ کے باب میں موقف یہ ہے کہ خلافت راشدہ تک تو اسلام کی تاریخ ہے اور بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کی تاریخ ثقافت کی تاریخ ہے اور عربوں اور ترکوں کی ہمعصر تاریخ عرب اور ترکی کی نسلیت کی تاریخ ہے اور برا عظم پاک و ہند میں سلاطین کے خاندانوں کی تاریخ ہے۔ اور اندلس کی تاریخ سرزمین ہسپانیہ پر گزرے ہوئے واقعات کی تاریخ ہے۔ اس طرح وہ وحدت اور تسلسل جو تاریخ کی جان ہے ختم ہو جاتا ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے اور دوسرے گروہ کی رائے ہے، کہ خلافتِ راشدہ سے چودہ سو سال کی تاریخ اسلام سے ابا، انحراف، انکار، سرکشی اور بغاوت کی تاریخ ہے اس طرح اسلام کی تاریخ ایک بے معنی اصطلاح ہو کر رہ جاتی ہے۔

علماء اکیڈیمی کے تربیتی کورس پر غور کریں تو سوال پیدا ہوگا کہ تقابل ادیان جدید فلسفہ سیاسیات عمرانیات، اقتصادیات جدید سائنس جدید منطق جدید علم کلام اور جدید اخلاقیات سے وہ کمی جو علوم دینیہ سے دینی نتائج حاصل کرنے میں ہو گئی ہے پوری ہو سکے گی؟

تقابل ادیان کا یہ مسئلہ کہ ادیان ما سبق کی تعلیمات پر قرآن مجید اور اسلام کے دوسرے مآخذ کا وہ کونسا مخصوص اضافہ ہے جو اسلام کو دوسرے ادیان سے متمیز کرتا ہے۔ اس باب میں بھی جب تک ایسا منہاج متعین نہ ہو جس سے ادیان ما سبق کا بے نتیجہ ہونا واضح ہو اور اسلام کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت مہیا ہو اسلام کو غیر محرف چاہے ثابت کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے عصر حاضر میں اسلام کے نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت مہیا نہ کر سکے گا۔

منطق جدید کا صرف یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ علم یقینی ناممکن ہے۔ کیونکہ علم بالحواس ہی علم ہے اور حواس سے یقین میسر نہیں آ سکتا۔

جدید عمرانیات کی معذوری یہ ہوگی کہ پہلے معاشرہ کا وجود عمرانیات کے موضوع کی حیثیت سے مسلّم ہو تو اس کا علم مدون ہوگا۔ عمرانیات سے معاشرہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ کی ہیئت ترکیبی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جدید اخلاقیات کا مسئلہ یہ ہے کہ اخلاقی فضائل (VIRTUES) کیا کیا ہیں؟۔ اخلاق کا معیار کیا ہے اور فضائل اخلاق اور معیار اخلاق کی مابعد الطبیعی اساس کیا ہے؟ یہ مسئلہ کسی زاویہ نگاہ سے حل کیا جائے، اس کے حل سے یہ مسئلہ کہ زندگی اخلاقی نمونہ کمال کے مطابق کیونکر ڈھلے گی؟ حل نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ تو سرے سے اخلاقیات کا مسئلہ ہی نہیں۔

اسی طرح ایک عادلانہ نظام معیشت کیسے وجود میں آئے؟ یہ مسئلہ معاشیات کا نہیں ہے معاشیات کا مسئلہ تو یہ ہے کہ رائج الوقت غالب نظام معیشت سے دولت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اور جیسا معاشرہ ہوگا ویسی معیشت ہوگی اور اسی کے تحت معاشیات مدون ہوگی۔ ان علوم کا

سہارا لینے سے زندگی کے اسلامی نمونے پر ڈھلنے کے امکانات اور اس کی آرزو دونوں ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس سے تو وہی عمل پیدا ہوگا، جس کی گنجائش سرمایہ داری یا اشتمالی نظامہائے معیشت میں ہے اور ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک میں بھی انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم رفع نہیں ہو سکتا اور جس نظامِ معیشت میں حقوق کا تصادم رفع نہ ہو وہ اسلامی نہیں ہو سکتا، اور جدید معاشیات اور انسانی ذہن کے وضع کردہ اسلامی علوم حقوق کا تصادم رفع کرنے میں مؤثر نہیں ہو سکتے۔ اگر حقوق کا تصادم رفع نہ ہو تو استبداد کے بغیر معاشی تخلیق ممکن نہیں رہتی۔

علیٰ ہذا القیاس جدید سیاسیات کے مطالعہ سے ریاست کو اسلامی بنانے کے لئے رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آمریت اور جمہوریت دونوں میں سے کسی نظام میں سیاسی تناقض (POLITICAL ANTINOMY) کا رفع ہونا ممکن نہیں۔ جمہوریت میں بھی حزبِ اختلاف کے تضاد کی وجہ سے سیاسی تناقض کا وجود برقرار رہتا ہے اور آمریت میں بھی ریاست کے لئے معاشرہ پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے، جیسا معاشرہ ہوگا ویسی ریاست ہوگی۔

علم کلام جدید ہو یا قدیم دونوں یقین انگیزی سے معذور ہیں۔ فلسفہ طرازیوں سے شبہات و تشکوک میں اضافہ ہو سکتا ہے کیونکہ جن مسلمات کی بنا پر اعتقاد کی اساس تلاش کی جا رہی ہے، وہ فی الحقیقت مذہبی حقائق کے انکار سے ماخوذ ہیں۔ جدید فلسفہ مذہب کے مقولات (CATEGORIES) نفسیات فاسد سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ یعنی (ABNORMAL PSYCHOLOGY) سے۔

"تعلیم" حیات ملی کو دوام و استمرار عطا کرنے کا عمل ہے اور مسلمان اسلام کی اساس پر ایک قوم ہیں۔ دین کی اساس پر ایک امت ہیں۔ اور ایک نظام افکار کے حامل ہونے کی حیثیت نے ایک پارٹی میں بحیثیت ایک قوم کے ہمارا محرک اسلام ہے۔ بحیثیت ایک امت کے ہماری دعوت غلبۂ اسلام ہے۔ یعنی منزل من اللہ قانون کا غلبہ اور بحیثیت ایک پارٹی کے ہماری وفاداری اپنے ہادیٔ اعظم اور اللہ کے آخری رسول محمدؐ رسول کی ذات پر مذکور ہے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

یہ محرک یہ دعوت اور یہ وفاداری محض معتقدات کلامیہ نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخی حقائق ہیں۔ ان حقائق نے ابتدا ہی سے اسلام کو سرسبز و شاداب رکھا ہے۔ لیکن ایک فرد کی طرح ایک ہیئت

عمرانی بھی زوال و انحطاط اور فوت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اجتماعی موت عبارت ہے۔ غائت کی بصیرت کے خیرہ ہوجانے تصور کائنات کے مسخ ہوجانے اور نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے سے۔

ہر چند کہ برعظیم پاک و ہند کے اس حصے میں ہم ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے درجے پر فائز ہو گئے مگر ذہنی، سیاسی اور معاشی سطح پر ہم پٹ کر رہ گئے۔ ہماری قوت فیصلہ مفلوج و مبہوت ہو کر رہ گئی اور ہم اپنی راہ التباس کے اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں اور پوری بصیرت نہ ہونے کی بنا پر ناگزیر انداز سے غیر اسلامی خصائص کو اپنے اندر جذب کرتے جا رہے ہیں۔

ہم اپنی دعوت کے شعور سے محروم ہو گئے ہیں اور اپنی عظیم الشان میراث کے بارے میں اپنے اندر ایک شرم ساری محسوس کرتے ہیں اور اپنے زوال پذیر معاشرے کے احیاء کے لئے مغرب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہماری اس بدحالی کا سبب ہے کہ ہم نے اپنی حیات اجتماعی کے سرچشموں (کتاب اور سنت) سے روگردانی کر لی ہے۔ ہم اس حقیقت سے بے نیاز ہو گئے ہیں کہ اختلال انگیز موثرات کے جواب میں قومی کردار کی مدافعت حیات اجتماعی کے سرچشموں ہی سے ولولہ اخذ کر کے کی جا سکتی ہے۔ ہم یہ بھول گئے ہیں کہ زندگی اپنی ارتقائی جدوجہد میں نظریاتی اساس کی طلبگار رہے اور "کتاب" ایک نظریاتی اساس مہیا کرتی ہے۔

انسان فطرتاً عمرانی الطبع ہے۔ اس کی فطرت اس حد تک عمرانی ہے کہ وہ بغیر معاشرے کے نہ وجود میں آسکتا ہے نہ ترقی کر سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام کا نصب العین ایک ایسا معاشرہ پیدا کر کے اسے بین الاقوامی سطح پر غالب کرتا ہے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہے۔ (صرف اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل نہ ہو۔) جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں اور اس معاشرے میں استحکام کی بنیاد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی خالص وفاداری ہے کہ شرک فی النبوت کا شائبہ پیدا نہ ہوسکے تاکہ معاشرہ اختلال کا شکار نہ ہونے پائے۔

لہذا دینی نظام تعلیم میں قرآن مجید ہی کو سرچشمہ ہدایت کی اور "سنت" ہی کو اس ہدایت کے مطابق نظام عمل کی حیثیت مسلم ہے۔ اگر یہ مسلمہ صحیح ہے تو ہمارے پاس اولاً تو مطالعہ قرآن کا

کوئی منہاج (METHOD) ہونا چاہیئے جو اس کے سوائے کچھ نہیں ہوسکتا کہ قرآن مجید نے جتنے دعوے کئے ہیں ان سب کو پیش نظر رکھ کر قرآن مجید کا مطالعہ ان شرائط کو دریافت کرنے کے لئے کیا جائے۔ جن کے پورا ہونے پر قرآن مجید کے ان دعووں کے سچا ہونے کا انحصار ہے اور یہ کہ قرآن مجید ان شرائط کے پورا کرنے کے لئے کیا ہدایت مہیا کرتا ہے۔

اس لئے قرآن مجید ہی سے اس کے نزول کے مقصد کو حاصل کرنے کی غایت کے پیش نظر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سے قرآن کے عطا کردہ علم میں یکسانی کا نمونہ (UNIFORM PATTERN OF KNOWLEDGE) پیدا ہوسکے گا۔ اور تعبیرات کے اختلاف نے جن الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے، ان سے نجات مل سکے گی۔

قرآن مجید کا مقصود ایک معاشرہ پیدا کرنا ہے تو قرآن ہی سے طے کیا جائے کہ معاشرہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی کیوں ہو؟ جن افراد پر اسلامی معاشرہ مشتمل ہو ان کا اخلاقی جدوجہد کرنے والا اور روحانی الذہن ہونا کیوں ضروری ہے اور افراد میں یہ خصائص کیسے پیدا ہوں گے؟ افراد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف وغم سے کیوں کر محفوظ کئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ کہ خوف وغم کی کیا کیا صورتیں ہیں جن سے قرآن نجات دلاتا ہے؟ اور نجات دلانے کی کیا حتمی تدبیر بتاتا ہے؟ افراد کے پسندیدہ نمونے پر ڈھالنے کے لئے قرآن مجید کیا لائحہ عمل تجویز کرتا ہے اور ہیئت اجتماعیہ کو کیسے وجود میں لاتا ہے اور معاشرے کی بقا اور ترقی کی کیا شرائط تجویز کرتا ہے اور معاشرے کو منظم رکھنے کے لئے کیا محرک فراہم کرتا ہے؟ اور قرآن کا دعویٰ ہے۔

ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا

انہ ذکر لک ولقومک

ان ھو الا ذکر للعالمین

تو

انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی سطح پر جدوجہد کرنے کے لئے علیحدہ علیحدہ کیا ہدایت مہیا کرتا ہے۔

قرآن مجید کی رو سے یقین عمل پر مقدم ہے تو یقین کے پیدا ہونے کی تدبیر کیا ہے؟ وہ یقین

جو عملی جدوجہد سے پہلے ضروری ہے۔ جس کے بغیر جدوجہد نہیں ہو سکتی کیسے پیدا ہوگا؟ اور عمل سے یقین کے راسخ ہونے میں کیونکر مدد ملے گی؟۔

جو یقین جدوجہد سے پہلے ضروری ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ ایک تو غایت تخلیق اور غایت بعثت اور غایت نزول قرآن ایک ہے۔ دوسرے کائناتی سطح پر جس تکوینی قانون سے نتائج مرتب ہو رہے ہیں، جسے ربوبیت کا قانون کہنا چاہیئے اور وہ مابعد الطبیعی اخلاقی قانون جسے قانون سعادت و شقاوت کہنا چاہیئے، ایک ہی کہنہ کائنات کے دو پہلو ہوں اور تاریخی قانون جو تاریخی تصادم کے نتائج کو متعین کرتا ہے اخلاقی قانون پر استقامت کے لئے محرک کی حیثیت اختیار کرے تو "ایمان بالغیب" یعنی ان نتائج کے حتماً و لازماً پیدا ہو کر رہنے کا یقین جو ابھی غیب میں ہیں عمل سے پہلے میسر آ سکتا ہے۔ قرآن مجید کے اس موقف کو سمجھنے کے بعد جدوجہد میں کامیابی حاصل ہونے سے تجربی شہادت حاصل ہو گی اور رسوخ فی الایمان حاصل ہو کر رہے گا اور قرآن کی طرف اس نقطہ سے رجوع کیا جائے تو شکوک رفع ہو جائیں گے۔

مگر حالت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک شگاف پڑ چکا ہے۔ ایک طرف جدید ذہن ہے جس کی حیثیت دور جدید کے اصلی قائدین کے مقابلے میں وہ بھی نہیں جو رنگ ماسٹر کے بالمقابل سرکس کے جانور کی ہوتی ہے۔ بایں ہمہ وہ ذہن اپنے آپ کو جدید سمجھتا ہے اور دوسری طرف مذہبی ذہن ہے۔ جس کے یقین کا یہ انداز ہے کہ وہ قرآن مجید کی ہدایت کے حتماً قطعاً اور یقیناً نتیجہ خیز ہونے کا چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اس لئے وہ قرآنی علم و ہدایت کو ناگزیر علم و ہدایت تسلیم نہیں کرتا، یہی بے یقینی ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید درس میں داخل ہی نہیں ہے، بلکہ تفسیری علوم قرآن مجید کا بدل بن گئے ہیں۔ (یعنی تفسیر تو درس میں داخل ہے اور قرآن مجید درس سے خارج) یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نہ اس ملک کے حکمرانوں کے نصاب میں داخل ہے نہ انصاف کرنے والوں کے نہ انصاف کرانے والوں کے نہ استادوں کے نہ معالجوں کے نہ نظم و نسق قائم کرنے والوں کے نہ پولیس کے نہ فوجی پشت پناہی کرنے والوں کے نہ اماموں کے نہ خطیبوں کے نہ فقیہوں کے نہ صوفیوں کے۔ حد یہ ہے کہ درس قرآن دینے والے درسی طور پر قرآن مجید کو پڑھے بغیر قرآن کا درس دیتے ہیں۔ لیکن بقول اقبالؒ۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

حدیث

علم دین میں حدیث کا مطالعہ ضرور داخل ہونا چاہیئے، ہر نصاب کا غایت تعلیم سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اگر مقصد کا شعور موجود نہ ہو تو تعلیم بھی ایک حرکت مذبوحی بن کر رہ جاتی ہے۔ لہذا سوال پیدا ہوگا کہ مطالعہ حدیث کا مقصد کیا ہو؟

قرآن مجید کا مقصود ایک معاشرہ قائم کرنا ہے اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ نزول قرآن اور بعثت کا مقصود ایک ہی ہے۔ حدیث کے مطالعہ کا مقصود بھی یہ ہونا چاہیئے کہ حدیث کے مطالعہ سے بعثت کے مقصود کو پانے میں مدد ملے۔ لہذا حدیث کا مطالعہ ان مسائل کے پیش نظر ہونا چاہیئے۔ کہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے حدیث سے اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد کی سیرت کی تشکیل کیونکر کی جاسکتی ہے؟ افراد معاشرہ کیسے بن سکتے ہیں۔ یعنی افراد کو معاشرہ بننے کی کیا اساس حدیث سے فراہم ہوتی ہے؟ فرد اور معاشرہ کا تضاد (جو اس دور کی مخصوصیت ہے) رفع کرنے کی از روئے حدیث حتمی تدبیر کیا ہے؟ معاشرے کی ترقی کی ان تین شرائط کے پورے ہونے میں حدیث سے کیا ہدایت میسر آتی ہے کہ

۱۔ انسانی شخصیت کی صحت مند نشوونما ہو،

۲۔ ہیئت عمرانی کی تکمیل کی جائے اور

۳۔ ماحول کو مسخر کیا جائے اندریں صورت کہ ماحول کے دو پہلو ہوں،

۱۔ قدرتی

اور

۲۔ انسانی

اور انسانی ماحول دو طرح کا ہو ایک بے تعلق دوسرے معاند،

معاشرے کا نظم وضبط کیسے برقرار رہے گا؟ اور اختلال کے مؤثرات کیا کیا ہو سکتے ہیں ان کا تدارک

کیسے کیا جائے گا۔ اگر موثرات اختلال غالب آجائیں زوال ہو جائے تو اس زوال کو عمرانی ثقافتی عروج میں بدلنے کی حتمی قطعی اور یقینی تدبیر جو حدیث سے حاصل ہوگی وہ کیا ہے؟ اور اس جدوجہد میں اسلامی کردار کو کیسے بحال کیا جاسکے گا۔ تاریخی انقلابات کے نتیجہ میں بدلے ہوئے حالات کے تحت موثراتِ اختلال کا تدارک کرنے کی تدبیر میں کیا تصرف مقاصدِ حدیث کے مطابق ہوگا؟

اصول حدیث کی روشنی میں مقبول الروایت اور مردود الروایتہ رواۃ کے معیار کو تاریخی بیانات پر بھی منطبق کرنا ہے۔ اس کے بغیر تاریخ میں حق و باطل کا امتیاز باقی نہ رکھا جاسکے گا۔

تخصص فی الفقہ کا مقصود فقہی نظام کی پشت پناہی کرنے والی قوت نافذہ کے بغیر اسے ایک ایسے اخلاقی ضابطے میں بدل دے گا۔ جسے فاعل اخلاق اپنے اوپر خود نافذ کرے یا نہ کرے اور بہ صورتِ حال دین کے فقہی نظام کو لادینیت (SECULARISM) سے سازگار بنا دے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کا مقصود قانون سازی میں اسلامی بصیرت مہیا کرنا ہو، فقہی اور اخلاقی نقطہ نظر کا امتیاز راسخ کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ اسلام کا تقاضا پورا کرنے کی یہ شرط کافی نہیں کہ "فقہی ضابطہ ہے کیا" بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ زندگی فقہی ضابطے کے تحت منضبط کیسے ہوگی اور اس کے لئے قوتِ نافذہ کی احتیاج کا شعور اور اسلام کے سیاسی نظریہ اور سیاسی تنظیم کے اسلامی ہونے کا شعور ضروری ہے جو صرف تخصص فی الفقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اسلامی تاریخ میں تخصص سے اسلام کے ناقابل عمل ہونے کا ہی انداز فکر پیدا ہوگا۔ اگر آغاز اسلام سے لے کر آج تک پوری تاریخ کو معمول بہ اسلام کی تاریخ قرار دیا جائے۔ اسلام کے قابل عمل ہونے کا اعتماد تاریخ سے فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ پہلے تاریخ اسلام کے

دورِ نبوتؐ

اور

دورِ مابعد نبوتؐ

میں امتیاز اور تعلق کو پیش نظر رکھا جائے اور اس امتیاز کو اگر اسلام سے انحراف کا نام دیا جائے جیسا کہ اس دور کے بعض نام نہاد مثال پرستوں (SHAM IDEALISTS) کا خیال ہے تو یہ نقطہ نظر نئی نسل کو اسلام سے انحراف کی راہ پر لے جائے گا۔

دورِ نبوتؐ کی جدوجہد اسلامی فضائل کو غالب کرنے کی جدوجہد کی تاریخ ہے اور دور مابعد نبوتؐ کی جدوجہد ان اسلامی فضائل کو جو غلبہ اسلام سے مسلم ہوگئے محفوظ رکھنے کی جدوجہد ہے۔ اس نقطہ نظر سے دور مابعد کی جدوجہد کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جدوجہد احتمال خطا سے پاک نہیں ہوسکتی۔ لیکن اصلاح احوال کی تدبیر کتاب سنت سے میسّر ہو تو زندگی کو دوبارہ معیار کے مطابق بنانے کا اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ زائل نہیں ہوتا اور اسلاف کے طرز عمل کو انحراف سے تعبیر کرکے اسلام کو قابلِ عمل باور کرانا ممکن نہیں رہتا۔

اگر تاریخ اسلام کو اس امتیاز کے پیش نظر پڑھانے کا اہتمام کیا جائے اور تاریخ اسلام کی تعبیر قرآنی قانون تاریخ کو اصول تعبیر مان کر کی جائے اور اس التباس کی وضاحت کی جاسکے جو فرقہ پرستی کے باعث پیدا کیا گیا ہے تو اسلام کے ماضی اور مستقبل دونوں کی نسبت اعتماد بحال کیا جاسکتا ہے۔

اگر اسلامی علوم کے سلسلے میں ریسرچ کے ذریعے مسائل اور ان کے حل کو از سرِ نو مدون نہ کیا جائے تو مسائل حیات کا وہ حل جو ہمارے غلبے کے دور میں موثر رہا ہے اور آج بے اثر ہوچکا ہے۔ اس وقت تک اسلام کے بارے میں اعتماد بحال نہیں کرسکتا۔ جب تک علوم کی از سرِ نو تدوین نہ کی جائے، اور علوم جدیدہ کا سہارا اسلامی علوم کی تدوین نو کے بغیر اسلام کے باب میں ہمارے یقین کو متزلزل کرے گا۔ مثلاً علوم جدیدہ میں سب سے اہم اس وقت عمرانیات ہے جو اس سوال کا جواب ہے کہ معاشرہ کیا ہے؟ کیسے وجود میں آتا ہے اور کیسے ترقی کرتا ہے؟ کیسے محفوظ رہتا ہے؟ اور کیوں کر اس کا زوال ہوتا ہے؟ عمرانیات کا یہ علم ایک مثالی معاشرہ عملاً قائم کرنے میں مددگار نہیں ہوسکتا۔ اس مسئلے کا حل تو قرآن سے از سرِ نو مدون ہونے والے علم سے مہیا ہوگا۔

اس طرح جدید اخلاقیات سے اسلام کے منافی نظریات اخلاق تو حاصل ہوسکتے ہیں مگر اخلاقیات کے مسئلے اور اخلاق کے مسئلہ میں فرق ہے۔ اخلاقیات کا مسئلہ تو یہ ہے کہ:

فضائل اخلاق کیا ہیں؟

اخلاق کا معیار کیا ہے؟ اور

فضائل اخلاق کی مابعد الطبیعی اساس کیا ہے؟

اوّل تو فلسفہ جدید سے جو جوابات حاصل ہوں گے وہ اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوں گے اور اگر ان مسائل کا صحیح ترین حل کتاب اور سنت کی روشنی میں دریافت بھی ہو جائے تو بھی اخلاق کا مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اخلاق کا مسئلہ یہ ہے کہ زندگی اخلاقی نمونہ کمال کے مطابق ڈھالی کیسے جائے؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے دو اور شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے ایک یہ کہ اخلاق کا نمونہ کمال پیش نظر ہو جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے دوسرے ایک ایسا محرک موجود ہو جو اس معیار کے مطابق زندگی ڈھالنے میں مددگار ہو استقامت کو برقرار رکھا سکے اور انحراف نہ کرنے دے۔ ان دو شرائط کے پورا کئے بغیر قرآنی نظریہ اخلاق بھی نظریہ ہی رہے گا۔ اور اخلاق اور اخلاقیات کے درمیان ایک التباس یہ ہے کہ اخلاقیات پر اخلاق کا وجود مقدم ہے۔ اخلاقی فضائل واقعی موجود ہوں تو اخلاقیات کا علم مدون ہوگا۔ اس لئے سقراط سے لے کر آج تک کے اخلاقیاتی (ETHICAL) فکر زندگی کو اخلاقی (MORAL) بنانے میں مدد نہیں مل سکتی اور ہم شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی نظریہ زندگی کو اخلاقی نمونے پر ڈھال سکے گا۔ مسلم فلاسفہ بھی اخلاقیات میں ارسطو کا نظریہ اپنائے ہوئے ہیں۔ جس کے مطابق نیکی افراط و تفریط کے درمیان نقطہ اعتدال میں مضمر ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ نقطہ اعتدال کہاں واقع ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن حکیم معیار "حکم" ہے کہ جو فعل اتباعِ حکم کی نیت سے صادر ہو وہ "نیک" ہے جو عمل حکم کی خلاف ورزی کی نیت سے سرزد ہو وہ "بد" ہے۔

ان تمام مشکلات کے پیش نظر مستشرقین کی پیروی کا قلادہ اپنی گردن سے نکال کر ریسرچ کی بنیاد پر مسائل کو حل کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک جدید معاشیات سے استفادہ کرنے کا تعلق ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ معاشی تخلیق تعاون کا عمل ہے اور یہ عمل فرائض کی بجا آوری کے ضمن میں جائز مفادات کی تکمیل پر منحصر ہے۔

قرآن نے ہر معاشی نظام کو بعض بنیادی تصرفات کے ساتھ اپنایا اور اسے اسلامی بنایا تھا۔ جب سے ہمارے ہاتھ سے معاشی انقلاب کی قیادت چھینی ہے ہم مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے جواب میں اسلامی نظام معیشت کا نعرہ لگانے والے یہ نہیں سمجھتے کہ معاشی نظام طریق

پیداوار سے متعین ہوتے ہیں اور طریق پیداوار آسمان سے نازل نہیں ہوتا۔ ہر معاشی نظام تاریخی موثرات کے تحت غالب یا مغلوب ہوتا ہے۔

اگر اسلام نے گلہ بانی نظام تجارتی نظام سرمایہ داری نظام زرعی نظام اور جاگیرداری نظام کی اصلاح کر کے ان نظاموں کو اپنایا تو آج کا ہمارا معاشی مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکی نظاموں میں کس انداز کا تصرف انہیں اسلامی بنا سکتا ہے؛ وہ تصرف یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حقوق کے درمیان جو تصادم سرمایہ داری اور اشتراکی نظام ہائے معیشت میں اس وجہ سے رفع نہیں ہوتا۔ کہ مطالبہ حقوق کے اصرار سے سرمایہ دارانہ معیشت میں محنت کشوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور اشتمالی معیشت میں اجتماعی حقوق پر اصرار کے باعث انفرادی آزادی اور انفرادی حقوق کی نفی کی جاتی ہے اور اسلام فرائض کی بجا آوری پر اصرار کر کے حقوق کے درمیان تصادم کو رفع کرتا ہے۔ لہٰذا ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ زرعی، تجارتی اور صنعتی معیشتوں میں وہ ضابطہ کیونکر نافذ کیا جا سکتا ہے جو فرائض کی بجا آوری کو لازم کرے۔

ہم نے بالکل اندھوں کی طرح دو متضاد حقوق صنعتی معیشت میں تسلیم کئے اور یہ تجویز ہمارے ملکی مفاد کے حق میں نہ تھی۔ ہڑتال کا حق دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حق عقلی، اخلاقی اور قانونی بنیاد پر اس وقت تک مسلم نہیں ہو سکتا، جب تک اس سے فتنہ و فساد وابستہ نہ ہو اور جس کا ایک اثر یہ تھا کہ اگر مزدور قبل از وقت تصادم کی غلطی کر کے مغلوب ہو جائے تو دیر تک (SOCIALISTIC REVOLUTION) اشتمالی انقلاب لانے کے قابل نہ ہو سکے اور دوسرا حق تالہ بندی کا تسلیم کیا گیا جس کا اثر یہ ہو سکتا تھا کہ اگر کارخانہ دار کی تالہ بندی سے مشتعل ہو کر اس کے صنعتی تخلیق کے سازوسامان کو تباہ کر دیں تو سرمایہ دار کو بین الاقوامی قرضے کی احتیاج بڑھ جائے۔

دونوں کے فرائض سے بے نیاز مطالبہ حقوق پر اصرار نے حقوق کے درمیان تصادم پر لا کر کھڑا کر دیا جس کا نتیجہ معیشت کی تباہی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور جدید معاشیات کے ماہر اس صورت حال کا مداوا کرنے سے قاصر ہیں اور یہ معذوری معیشت کے بارے میں قرآنی نقطہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ از روئے قرآن زندگی ایک وحدت ہے اور اخلاق اور معیشت اس آئینہ پاک کی رو سے باہم دگر جوابی اضافی مستعفانی اور وجوبی طور پر مربوط ہیں۔

لن تنالوا البر حتیٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّون ۰

تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے انفاق نہ کرو، انفاق فاعل اخلاقی نیکی ہے اور اس انفاق سے مستفید ہونے والے کی معیشت ہے۔ اس طرح نیکی اور معیشت ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اور اسلامی معیشت معاشی تخلیق کے عمل کے اخلاقی ضابطے سے سازگار ہونے میں مضمر نہیں جیسا کہ بعض خود ساختہ مصلحین کا خیال ہے بلکہ وہ معاشرے کے ہر فرد کی تخلیقی جدوجہد میں تعطل کو رفع کرنے سے وابستہ ہے اور جدید معاشیات میں اس طرح کا کوئی تصور موجود نہیں جو اس آیۃ پاک میں مسلم ہے۔

فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم،

یعنی ان کے اموال میں سائل اور محروم کا حق متیعن ہے۔

تقسیم ترکہ میں ۲/۳ سے خونی رشتے کے وارثوں کی تخلیقی جدوجہد کا تعطل دور کرنا مدنظر ہے اور ۱/۳ سے وصیت کے ذریعے ان لوگوں کا بھی تعطل دور کیا جا سکتا ہے جو خونی رشتے سے ورثہ نہیں پا سکتے۔ تقسیم ورثہ کے احکام پر مشتمل آیات کو وصیت والی آیات کا ناسخ قرار دینا اور حق الخدمت کو حق وراثت کی لم قرار دیتے وقت یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد تولد ہونے والے بیٹے کو حق وراثت کن خدمات کے صلے میں حاصل ہوتا ہے۔

اگر معیشت کی تباہی کے اقدام سے ریاست تباہ ہو سکتی ہو تو وہ عمل جو اس تعاون کو مٹائے جو تخلیق معیشت کے لئے ضروری ہے "بغاوت" کے برابر لائق تعزیر ہے۔ مگر یہ سب پہلو اس وقت اہم ہو سکتے ہیں جب فی سبیل اللہ پاکستان کے حق دار پاکستان کی بقا کے سلسلے میں اپنے اندر کوئی اضطراب محسوس کریں اور اس فکر کو مدون کرانے کا اہتمام کریں، جس کی تدوین پر موجودہ پاکستان کی بقا کا انحصار ہے۔ صرف تجدد پرستی سے پاکستان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

علماء کے لئے علوم جدید پر لیکچرز کے سننے میں اگر نگاہ انتخاب ایسے اساتذہ پر پڑے جن کے نزدیک خدا کا تصور ایک ایسا تصور ہو جس کے متوازی کوئی حقیقت موجود نہ ہو اور وہ برملا بانگِ دہل اس خیال کی تبلیغ کرتے رہے ہوں تو سوائے اس کے کہ نام نہاد علوم جدیدہ کے سہارے اسلام کی حقانیت کی نسبت ذہن کشمکش میں مبتلا ہوگا یا موجودہ نظام تعلیم سے مفاد پرستانہ وابستگی پیدا ہوگی، اور کوئی

نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔

علوم جدیدہ میں جن لوگوں کی حیثیت یہ ہے کہ وہ سالہا سال سے نیوکلیر ریسرچ کے انچارج ہیں اور ریسرچ میں تنکے کے برابر اضافہ نہیں کرسکے ان سے تو علوم جدیدہ کے بے نتیجہ ہونے کا سوال کوئی نہ کرے مگر علماء کو علوم جدیدہ کا سکھانا اس لئے ضروری ٹھہرائے کہ ان میں اس کے بغیر دینی قیادت کی اہلیت پیدا نہیں ہوسکتی، یہ مسئلہ انتہائی غور وفکر کا طلبگار ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پوری قومی زندگی کا مقصود تعلیم ہی کا مقصود ہے۔ دینی اور لادینی نظام تعلیم کی ثنویت اور اس کا تضاد جو محکومی کا ورثہ ہے اس کا رفع کیا جانا ضروری ہے اور فارغ التحصیل متخصصین کا کوئی مستقبل ہو اور حیات قومی کے مختلف پہلوؤں میں کوئی وظیفہ وہ ادا کرسکیں تو بہترین نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اگر جامعہ اسلامیہ اور علماء اکیڈیمی کے نصابات میں ہماری جدید یونیورسٹیوں کا علمی نظام نمونے کی حیثیت سے پیش نظر رہے تو دونوں نظام تعلیم بے نتیجہ ثابت ہوں گے، اگر اصلاح مطلوب ہے تو علوم کو تحقیق و تخصص کی بنیاد پر از سر نو مدون کرانے کے لئے ایک منصوبہ اسلامک ریسرچ کا تیار کرنا ہوگا۔ جس میں منہاج تحقیق پر اس نظر سے توجہ رکھنا لازم ہوگا کہ مسائل حیات میں رائے قائم کرنے کا معیار ایسا ہو جو دینی اور دنیاوی علوم کو تنقید کے لئے یکساں مفید ہو۔

اگر علوم جدیدہ پر علماء اکیڈیمی میں لیکچرز ضروری سمجھے جائیں تو حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

۱۔ علوم اور فلسفہ کی نشوونما میں دو قسم کے تدریجی عمل پائے جاتے ہیں۔ ایک منطقی تدریج و ارتقاء اور دوسرا تاریخی تدریج کا عمل اور دونوں کا متوازی ہونا ضروری نہیں ہے۔

۲۔ منطقی تدریج ارتقاء کے عمل میں بھی تین مدارج ہیں۔

عقلیت = اثبات

حسیت = نفی

تنقید =

اور تاریخ تدریج کے عمل میں بھی تین مدارج ہیں۔

قدیم

وسطی

جدید

اور ان تینوں ادوار میں منطقی تدریج نمایاں ہے۔ علی الخصوص فلسفیانہ فکر کی نشوونما میں۔

ان امور کے پیش نظر یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا کہ یہ بات ہرگز ضروری نہیں کہ جدید ترین فکر کامل ترین ہو۔

ان امتیازات کی روشنی میں صرف جدید علوم فلسفہ اور انسانی علوم (HUMANITES) میں تنقیدی منہاج (METHOD) کے مطابق نتائج اخذ کئے جائیں تو دینی مقاصد کے ساتھ سازگار فکر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اگر

یہ امتیازات ملحوظ نہ رہیں تو مذہبی حقائق اور دینی مصالح کے تعلق میں بے یقینی اور بے اعتمادی اور تشکیک کا نقطہ نظر پیدا ہوگا۔

اگر یہ بات واضح ہو تو تفصیل بھی مہیا کی جا سکتی ہے۔